https://telegram.me/ilmokitab

ابراہیم سلیمان سیٹھ

(ملک وملت کا ایک بے لوث خادم)

ذیل کا مضمون ان تحریروں کی روشنی میں لکھا گیا ہے جو مرحوم پر بعض اردو اور انگریزی رسالوں میں چھپی ہیں۔ اس میں کہیں کہیں تاثرات کا جو عنصر ہے وہ ظاہر ہے کہ راقم کا اپنا ہے۔ (م.ث.عمری)

بیسویں صدی کا ابتدائی زمانہ تھا کہ ٹیپو سلطان شہیدؒ کے شہر میسور میں ایک سیٹھ خاندان رہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ارکان وافراد دولت مند تھے اور ملک وملت کا درد رکھتے تھے۔

اس کنبے کے دو سگے بھائیوں کے نام اور کام سے متعلق دو چار باتیں سن لیجیے:

بڑے محمد سلیمان سیٹھ تھے۔ ایک صدی سے کہیں زیادہ مدت بیت گئی۔ تعین کے ساتھ ۱۹۵۱ء کی بات ہے کہ انھوں نے یونی ورسٹی بننے سے بہت پہلے مدرسۃ العلوم، مسلمانانِ علی گڑھ سے گریجویشن کیا۔ یہ جیالے اردو، فارسی اور انگریزی تین تین زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ یہ گویا ان کا سہ لسانی فارمولا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اپنے خاندان کی ناک تھے۔

پھر یہ نہیں کہ آپ خوش عالَم ونگ کا عالَم رہا ہو۔ جی نہیں، اپنے علم وفضل سے ملک وملت کی بساط بھر خدمت کی۔ وقت کی تحریک خلافت اور ترکِ موالات کے فعال کارکن رہے۔ اب سو سال بعد تجاہل شعار دنیا کو کون سمجھائے کہ یہ تحریکیں کیا تھیں، کیسی تھیں!

اور ہاں ان سلیمان صاحب کے چھوٹے بھائی عبدالستار سیٹھ صاحب کی بابت بھی دو چار باتیں ہو جائیں۔ بڑے بھائی کے دوش بدوش خود بھی خوب لکھا پڑھا ہوگا، اعلیٰ تعلیم پائی ہوگی، تبھی تو تقسیم کے بعد پاکستان جا سعودی عرب میں اس نوزائیدہ ملک کے پہلے سفیر بنے۔

اب سرحد پار سے اپنے گھر آیئے، اور سنیے کہ ٹیپو شہیدؒ کے شہر میسور میں ۳؍نومبر ۱۹۲۲ء کو سلیمان سیٹھ صاحب کے دولت کدے پر ایک لڑکا پیدا ہوا، جو غالبًا پہلوٹھا تھا۔ نام ''ابراہیم'' قرار پایا۔ اب ہمارے صاحبِ سوانح ''ابراہیم سلیمان سیٹھ'' کہلانے لگے۔ اسی نام سے وہ نامی اور نام ور ہوے۔ شانِ ابراہیمی دم کے ساتھ رہا کی۔

قلم خود بخود آگے نکل گیا۔ آمدم برسرِ مطلب۔ ان ''سیٹھ بچے'' کی ابتدائی تعلیم ۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۱ء تک میسور ہی میں ہوی۔ پندرہ برس کے تھے، میٹرک پار ہوگئے ہوں گے کہ اس خاندان کو بڑا دھچکا لگا۔ ۷۴؍سال کی عمر میں شفیق باپ نے آنکھیں بند کرلیں۔ مالی مسائل کھڑے ہوگئے، کیوں کہ آبائی پیشہ پارچہ بافی کی تجارت کا نگران کوئی نہیں تھا۔ ایسے میں ماں زینب بائی کی ہمت آڑے آئی۔ جی کڑا کر کے بیٹے کو ساتھ لے اپنے میکے کیرالا اٹھ آئی۔ بھائی کے گھر رہنے لگی۔

مرحوم وصیت کر گئے تھے کہ نورِ نظر کو اچھی تعلیم دلائی جائے۔ یہ بات وفا شعار زینب نے گرہ میں باندھ لی تھی۔ اس مہم کے لیے انھوں نے بنگلور کو پسند کیا۔ اٹھ کھڑی ہویں، اور بڑی ہمت و استقامت سے کام لیا۔ اسکولی مرحلہ غالبًا کیرالا ہی میں طے ہو چکا تھا۔ یہاں آکر نوجوان سیٹھ نے St.Josephs College میں بی اے کیا۔ اس کورس میں آپ کے اختیاری مضامین یہ تین تھے: معاشیات، سیاسیات اور تاریخ۔ اس کے بعد انھوں نے قانون کا کورس پڑھنا چاہا۔ جانے کیا کھنڈت پڑ گئی کہ دل کی دل ہی میں رہ گئی۔

اس کے بعد قرائن سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے انگریزی ایم اے یا آنرز کیا۔ یہ ہم اس لیے کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی مادرِ علمی میں چندے لکچراری کی تھی۔ ظاہر ہے اس عہدے پر ایم اے وغیرہ کے بغیر تقرر ہو نہیں سکتا۔

بہر حال اس خادمِ ملک و ملت کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دو تین تعلیمی اداروں میں

تدریسی خدمات انجام دی تھیں۔ پر خارزارِ سیاست سے دل چسپی کے باعث یہ سلسلہ ختم کردینا پڑا۔
یکے گیر محکم گیر۔

سیٹھ صاحب کی کتابِ زندگی کا سب سے اہم باب سیاست ہے۔ اس باب میں گزارشات پیش کرنے سے پہلے ہم ان کی نجی زندگی کا ذکر کرتے ہیں کہ یہ ضروری ہے، کہ اول با آخر نسبتے دارد۔

۱۹۴۹ء تھا کہ سیٹھ جی کی خانہ آبادی کوچین میں مریم بائی سے ہوی۔ کچھ مدت گزری ہوگی کہ اہلیہ کی موروثی جائیداد کے بارے میں جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ لگتا ہے کہ صورت حال زیادہ ہی بگڑ گئی تھی، اور معاملے کی یکسوئی نہیں ہورہی تھی۔ لہٰذا سیٹھ صاحب کی خوش دامن صاحبہ نے داماد میاں کو بصد اصرار بلایا کہ آئیں اور مسئلے کا فیصلہ کریں۔

صورت حال کی نزاکت دیکھ کر سیٹھ صاحب کوچین تشریف لے گئے، اور ایک مدت طویل تک رہ کر اس تصفیہ نامرضیہ کا فیصلہ خوش اسلوبی کے ساتھ کردیا۔ اس بکھیڑے کی یکسوئی کے بعد سیٹھ صاحب اپنی ساس صاحبہ کے ساتھ جا سعادتِ حرمین سے مشرف ہوآئے۔ یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے۔

اور ہاں کوچین واپس ہوکر انھوں نے کمر کھول دی۔ خانہ آبادی جس جگہ کی تھی، وہیں آباد ہوگئے۔

۱۹۴۸ تھا، ملک نیا نیا آزاد ہوا تھا۔ سیٹھ صاحب ۲۶ رسالہ نوجوان تھے۔ نئے نئے لکچرار ہوے تھے۔ تدریسی زندگی پُرسکون ہوا کرتی ہے، اور معاشی حیثیت سے فی الجملہ اطمینان بخش، مگر اللہ کی مشیت اس بات کی متقاضی ہوی کہ ان کی صلاحیتیں ان کی مادرِ علمی کی چار دیواری تک محدود ہوکر نہ رہ جائیں، بلکہ مادرِ وطن کے کام آئیں۔ گویا الہام کے فرشتے نے ان کے کانوں میں سرگوشی شروع کردی تھی:

بال بہ کشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن　　　حیف باشد چوں تو مرغے کہ اسیر قفسی

(بال و پر کھول اور طوبیٰ کے درخت سے اپنی آواز بلند کر۔ یہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ تجھ جیسا عقابی پرندہ پنجرے کا قیدی بن کر رہ جائے)

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دریافت کیا جائے کہ اس انقلابِ حال کا سبب کیا تھا؟ انھوں نے کیوں کالج کے گوشۂ خلوت وعافیت کو خیر باد کہا، اور اپنے لیے ایک وسیع سیاسی میدانِ عمل پسند کیا۔

گزر چکا ہے کہ وہ انگریزی کے پروفیسر تھے۔ اب یہ سنیے کہ وہ اردو زبان کے بڑے شیدائی تھے، جوان کی مادری زبان تھی۔ ان کے عمر بھر کے تعامل سے جس کی شہادت بعض ثقہ لوگوں نے بھی دی ہے، یہ بات عیاں ہے کہ وہ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے بڑے مداح اور عاشقِ زار تھے، اور اپنی تقریروں میں ان کے فکر انگیز اور روح پرور کلام سے خوب کام لیتے تھے۔ ان کے اشعار تحت اللفظ جھوم جھوم کر پڑھتے تھے۔ اس بنا پر یہ کہنا ہر طرح بجا ہوگا کہ اقبال کے پیام نے زندگی کے عبوری دور ہی میں انھیں متاثر کیا، اور اسے ایک انقلابی موڑ عطا کیا۔ اقبال نے ایک جگہ کہا ہے:

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل

اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

ہمارا خیال ہے، یہ اور اس قسم کے اقبال کے بے شمار اشعار نے ایک حساس نوجوان پر ''از دل خیزد و بر دل ریزد'' کا کام کیا، اور انھیں لکچراری کے خول سے نکال کر ایک وسیع میدانِ حرکت و عمل کا بہادر سپاہی بنا دیا ع یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

بہر حال ۱۹۴۸ء ہی تھا کہ انھوں نے مسلم لیگ، شاخ میسور کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اپنی طویل ستاون سالہ زندگی کا آغاز کر دیا، اور تدریسی زندگی کو دونوں ہاتھوں سے سلام کیا:

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

مگر جلد ہی معلوم ہو گیا کہ سرزمینِ ٹیپو پر مسلم لیگ کے پاؤں جمنے والے نہیں۔ اب کیا کیا جائے؟ انھوں نے ہم سایہ ریاستِ کیرالہ کا خیال کیا، جس سے ان کے دو دو رشتے تھے۔ وہ پہلے سے ان کی ننھیال تھی کہ ان کی والدہ زینب بائی، کنور ضلع کی تھیں۔ اب کیرالہ ان کا سسرال بھی تھا کہ ان کی اہلیہ مریم بائی بھی اسی ریاست کی تھیں۔ اب سیٹھ صاحب میسور کے قدیمی علائق کی گرد جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کوچی (کیرالہ) آرہے:

منعم بکوہ و دشت و بیاباں غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

(فیاض اور سخی آدمی پہاڑوں اور بیابانوں میں بھی اجنبی نہیں ہوتا۔ وہ جہاں کہیں قدم رکھتا ہے، خیمہ لگا دیتا اور دربار سجا لیتا ہے)

سرزمینِ کیرالہ پر ان کی بڑی قدر ہوی، اور کامیابی نے ان کے قدم چومے:

وہ پھول سر چڑھا جو چمن سے نکل گیا
عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا

چناں چہ ۱۹۶۱ء میں ہمارے سیٹھ صاحب کیرالہ اسٹیٹ مسلم لیگ کے سکریٹری منتخب ہوے، اور ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۳ء تک دس گیارہ برس نائب صدر رہے۔ ریاستی سطح پر بارہ تیرہ برس تک ان دو عہدوں پر فائز رہنے کے بعد وہ ۱۹۷۳ء میں انڈین یونین مسلم لیگ کے صدر بن گئے۔ اس عہدے پر وہ ۱۹۹۳ء کے اواخر تک پورے بیس برس برقرار رہے، اور قائد ملت محمد اسماعیل صاحب مرحوم کی جانشینی کرتے رہے۔

مگر امت مسلمہ کی قسمت میں اتحاد و اتفاق کہاں لکھا ہے۔ ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کا انہدام ہوا۔ اس وقت سیٹھ صاحب کا نقطۂ نظر بجا طور پر یہ تھا کہ مرکزی کانگریسی حکومت نے اغماض سے کام لیا ہے۔ مسجد کی حفاظت سے پہلوتہی کیا ہے۔ اس لیے ریاستی سطح پر مسلم لیگ کیرالہ کی کانگریسی (UDF) سرکار سے اپنے تعلقات ختم کرلے، مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز۔ لیگی لیڈروں نے ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ اس پر سیٹھ صاحب نے بددل ہو کر لیگ کی صدارت سے استعفاء دے دیا، اور ۱۹۹۴ء کے اوائل میں انڈین نیشنل لیگ نامی ایک نئی پارٹی قائم کی، اور حینِ حیات اس کے صدر رہے۔

پارٹی کے مختلف عہدوں کے دوش بہ دوش وہ پارلیمنٹ کے لیے بھی منتخب ہوتے رہے۔ ۱۹۶۰ء تھا کہ وہ پہلی بار راجیہ سبھا کے رکن چن لیے گئے۔ اس کے بعد وہ ۱۹۶۷ء میں لوک سبھا کے رکن منتخب ہوے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان کا حلقۂ انتخاب ہر بار کیرالہ ہی کا کوئی مقام ہوتا۔ ہر بار وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوتے۔ وہ کل ملا کر لوک سبھا کے لیے آٹھ مرتبہ منتخب ہوے۔ وہ پارلیمنٹ میں اپنے جونیر رفیق محمود بنات والا صاحب کے ساتھ مسلمانوں کے کاز کی حمایت میں بغیر مفاہمت اور مداہنت کے بے لاگ آواز اٹھاتے، اور حق گوئی کا حق ادا کرتے۔

مسلم لیگی ہونے کے باوجود سیٹھ صاحب نے حکم راں حلقوں میں اپنی صلاحیت وقابلیت کا لوہا منوالیا تھا۔ وہ مختلف پارلیمانی وفدوں کے رکن کی حیثیت سے ۱۹۷۱ء میں مسلم ملکوں: ترکی، ایران

اور افغانستان کا، اور ۱۹۷۵ء میں سوئزرلینڈ اور انگلینڈ کا دورہ کر آئے تھے۔ رہے اندرونِ ملک کے اسفار تو یہاں شاید ہی کوئی ایسا بڑا مقام ہوگا جہاں ملی ضرورتوں سے ان کے قدم نہ پہنچے ہوں۔

ملی ضرورتوں کی بات آ گئی ہے تو یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ سیٹھ صاحب مرحوم مسلمانوں کی ہر کل ہند تنظیم سے وابستہ، اور اس کے بڑے متحرک کارکن رہے۔ چناں چہ وہ مسلم پرسنل لا بورڈ، بابری مسجد کوآرڈینیشن کمیٹی وغیرہ تنظیموں سے دل چسپی لیتے، اور ان کے جلسوں میں برابر شرکت کرتے رہے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کے لیے وہ برابر کوشاں اور چوکھی لڑائی لڑتے رہے۔ مولانا علی میاںؒ نے لکھا ہے کہ نومبر ۱۹۶۶ء میں کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے دورۂ جنوبی ہند میں سیٹھ صاحب (جو اس وقت ۴۴ برس کے تھے) برابر ساتھ تھے اور بعض مقامات پر بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں بھی کی تھیں۔ (بارہ دن ریاست میسور میں، از: مولانا علی میاںؒ)

سیٹھ صاحب ''ندوۃ المجاہدین کیرالہ'' کے مکتبِ فکر کے آدمی تھے، مگر تعصب سے بری تھے۔ سب سے ملتے ملاتے، سب کے کام آتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سیاسی حریفوں سے بھی کھلے دل سے ملتے تھے، اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ گویا کہہ سکتے تھے ع از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ان کے حالاتِ زندگی میں ایک بات خاص طور پر یہ لکھی گئی ہے کہ سیاسی مشاغل میں تصنیف و تالیف کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں تھا۔ تاہم انھوں نے اردو زبان میں کچھ کتابیں لکھ کر چھپوائی ہیں۔ معلوم نہیں یہ کتنی ہیں اور کس موضوع پر ہیں۔ انھیں دینیات اور اسلامی تاریخ سے بڑی دل چسپی تھی —— یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سیٹھ صاحب ایک رسالے کے مدیر بھی تھے، جو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی اردو سوسائٹی کے زیرِ اہتمام چھپ کر شائع ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

اصل یہ ہے کہ سیٹھ صاحب سیاست کے مردِ میدان ہونے کے ساتھ شعر و ادب کا بھی بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ رزم کے ساتھ بزم کے بھی آدمی تھے۔ مولانا علی میاںؒ نے مجلسِ مشاورت کے بعض ارکان کی ٹیپو سلطان کی تربت پر حاضری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سبھی پر ایک کیف کا عالم طاری تھا......... میں نے اپنے عزیز رفیق ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب سے، جن کو اللہ نے ادب کا پاکیزہ ذوق اور خصوصیت کے ساتھ اقبال کے کلام کے

ساتھ اعلیٰ شغف عطا فرمایا ہے، فرمائش کی کہ وہ اس موقع کے مناسب اشعار پڑھیں۔ انھوں نے ظفر علی خاں مرحوم کے دو شعر پڑھے۔ موقع و محل اور حسنِ انتخاب نے ایک سماں باندھ دیا۔ پہلا شعر تو مجھے یاد نہیں رہا، دوسرا شعر یہ تھا:

اس کے اٹھتے ہی مسلمان کا گھر بیٹھ گیا
تھا قیامت کا قیام، اور قیامت کا قعودؔ"

(بارہ دن ریاست میسور میں، ص: ۲۰، ۲۱)

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ سیٹھ صاحب کی حیات و خدمات سے متعلق ایسے حالات و واقعات تھے جو کسی بھی انسان کی ذاتی، سیاسی اور علمی زندگی میں عموماً پیش آتے ہیں، جن میں کوئی اچنبھا نہیں ہوتا، اور جنھیں پڑھ کر ہم کہتے ہیں کہ ایک پبلک زندگی میں اتنا بھی نہ ہو تو اس میں دنیا کے لیے کیا نمونہ ہو سکتا ہے! اس کے احترام میں ہمارے سر کیوں کر جھک سکتے ہیں، وہ ہماری نظر میں کیوں کر جچ سکتا ہے! جیسے ہم ویسا وہ، اس میں غیر معمولی بات کیا ہوئی؟

اس سوال کے جواب میں ہم اس قائدِ ملت کی اعلیٰ صلاحیت و قابلیت کے تذکرے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتے چلیں کہ ان کی طبیعت کیسے خمیر سے گوندھی گئی تھی، ان کی سیرت کا اصلی جوہر کیا تھا، اور وہ سیاسی بصیرت کی کیسی منہ بولتی تصویر تھے۔ اس سلسلے میں درج ذیل واقعات ملاحظہ ہوں:

m تاریخِ اسلام کی یہ ایک تلخ ترین حقیقت ہے کہ خیر امت کی وحدت کو اپنوں کی غلطیوں اور غلط فہمیوں، اور غیروں کی ریشہ دوانیوں اور مصلحت اندیشیوں نے جس طرح پارہ پارہ کر دیا، اور ان کی صفوں میں انتشار اور خلفشار پیدا کر دیا ہے وہ ہماری ملی زندگی کا نہایت دردناک المیہ ہے۔ مسلمان باہم لڑ کر اور کٹ کر متوازی کیمپوں اور مخالف محاذوں میں صف آرا رہتے ہیں۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم رو رو کہہ گئے ہیں:

خوشامد کرتے ہیں غیروں کی اور آپس میں لڑتے ہیں
یوں ہی بربادیاں آتی ہیں، یوں ہی گھر بگڑتے ہیں

اسی طویل سلسلے کا ایک محاذ شیعہ سنی مناقشہ ہے۔ ابھی پچھلی صدی کی نویں دہائی کی خون رلانے والی بات ہے کہ لکھنؤ میں یہ نزاع زوروں پر تھی۔ بات بڑھتی ہی جارہی تھی۔ آخر کار فریقین کی عرض داشت الہ آباد ہائی کورٹ میں اس مضمون کی پیش ہوی کہ ہم ابراہیم سلیمان سیٹھ کو حَکَم مانتے ہیں۔ ہماری نظر میں وہی ایک اس منصب کے اہل ہیں۔ چناں چہ ہائی کورٹ نے سلیمان صاحب ہی کو حَکَم قرار دیا۔ وہی ثالث بالخیر ٹھہرے۔ یہ واقعہ سیٹھ صاحب مرحوم کی سیرت میں سنہرے حرفوں میں نقش ہونے کے قابل ہے کہ انھوں نے اس معاملے میں عظیم قائدانہ کردار ادا کیا۔ انتہائی محنت، بڑے صبر اور برداشت اور گہری سمجھ بوجھ سے کام لے کر فریقین کی باہمی کشیدگی اور ناچاقی دور کردی۔ انھیں باہم شیر وشکر کردیا اور ہر طرح اس اعتماد کے اہل ثابت ہوے جو طرفین نے ان پر کیا تھا۔ ذرا غور کرکے بتایا جائے کہ کیا یہ کچھ آسان کام تھا؟۔

○ سیٹھ صاحب مسلم لیگ کے صدر تھے اور اس اصول کے زبردست حامی کہ لیگ مسلم اقلیت کی سیاسی پارٹی ہے۔ اس حیثیت سے اس کا اولین فریضہ ہے کہ مسلم مفادات کا تحفظ کرے اور کوئی ایسا اِقدام نہ کرے، جس سے ملی مفادات پر زد پڑتی ہو۔ لیگ کے نمایندوں کو اپنی انفرادیت کے ساتھ اپنی پارٹی کے تشخص کی بھی حفاظت کرنی چاہیے۔

اس اصول پسندی کا امتحان اس وقت پیش آیا جب کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی نے سیٹھ صاحب کو ایمرجنسی کے نفاذ سے پہلے کہلا بھیجا کہ انڈین یونین مسلم لیگ، انڈین نیشنل کانگریس میں ضم ہو جائے۔ اس صورت میں لیگ کے صدر مرکزی کابینہ میں شامل کرلیے جائیں گے۔ انھیں ان کی پسند کا قلم دان دے دیا جائے گا اور دوسرے لیگی لیڈر سی ایچ محمد کویا صاحب کو کیرالہ کا وزیر اعلیٰ بنا دیا جائے گا۔

پارلیمنٹ میں لیگ کے ارکان کبھی دو تین سے زیادہ نہیں رہے۔ ریاستی اسمبلی میں اس کے ممبران اتنے کہاں رہے ہوں گے کہ اس کے بل بوتے پر کوئی مسلمان وزیر اعلیٰ بن سکتا۔ ایسے میں آنجہانی اندرا گاندھی کی یہ پیش کش ایک نعمتِ غیر مترقبہ تھی۔ کوئی سبک سر ہوتا تو بے تحاشا لپکتا۔ مگر سیٹھ صاحب اور ان کی پارٹی نے معذرت کردی۔ یہ کتنا بڑا مجاہدہ تھا!:

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ　　　　کہ عنقا را بلندست آشیانہ

(جاؤ، جاؤ، یہ جال کسی اور پرندے کے لیے بچھاؤ۔ میں عنقا اپنا گھونسلا بلندیوں پر رکھتا ہوں)

سیٹھ صاحب بڑے باک اور جری آدمی تھے۔ وہ حب الوطنی میں کسی بڑے سے بڑے محبِّ وطن سے پیچھے نہیں تھے۔ ان کی وفاداری کسی پارٹی یا کسی پارٹی کی حکم رانی سے نہیں، ملک اور اس کے دستور کے ساتھ تھی۔ دستوری دائرے کے اندران کی وفاداری مسلمانوں کے ساتھ تھی، جن کے وہ نمائندے تھے اور اپنے اس موقف پر پوری طرح اٹل رہتے تھے۔

اندرا گاندھی ہی کی حکم رانی کا زمانہ تھا کہ ایک پاکستانی صحافی نے ان سے سوال کیا کہ کیا اِندرا کے دورِ حکومت میں مسلمان محفوظ و مامون ہیں؟ سیٹھ صاحب نے کسی سیاسی حکمتِ عملی اور لاگ لپیٹ کے بغیر صاف صاف کہہ دیا کہ نہیں، محفوظ نہیں ہیں۔ کانگریسی حکومت میں مسلمان بار بار ستائے گئے ہیں، جان و مال کے نقصانات سے دوچار ہو چکے ہیں۔ ایک ہندوستانی سیاست داں کا پاکستانی سرزمین پر یوں کھری کھری بات کہہ دینا بڑے دل گردے کی بات تھی، اور سیٹھ صاحب اس دل گردے کے انسان تھے۔ نتائج وعواقب سے بالکل بے پروا : ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اسی سلسلے کی بات ہے کہ سیٹھ صاحب کی صاف گوئی سن کر اندرا جی کہنے لگیں کہ مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے معاملے میں سیٹھ صاحب انھیں پریشان کرتے ہی رہیں گے۔ پس چہ باید کرد؟ وہ سیٹھ صاحب کی صلاحیتوں کی اندازہ شناس تھیں۔ اس لیے تجویز کیا کہ انھیں اقوامِ متحدہ میں ہندوستان کا سفیر بنا کر بھیجا جائے۔ یہ ۱۹۷۰ء کے بعد کی بات ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ کیسے آہنی عزم و ارادے کے مالک تھیں۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سیٹھ صاحب نے یہ پیش کش مسترد کر دی تو اندرا جی کس قدر جھنجلائی ہوں گی۔

اس انکار پر بعض اعلیٰ عہدے داروں کی یہ رائے تھی کہ سیٹھ صاحب نے ایسا کر کے کچھ اچھا نہیں کیا۔ ترقی کے بہترین مواقع کھو دیے۔ ایک معتمد علیہ کے پوچھنے پر کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ سیٹھ صاحب یوں گویا ہوے:

”دیکھو بات ایسی ہے کہ باضابطہ ہندوستانی سفیر ہونے کی حیثیت سے مختلف قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر مجھے ایسے بیانات دینے پڑیں گے جو ملک کے مسلمانوں کے مفادات

کے خلاف ہوں گے۔ اس صورت میں میں قیامت کے دن اللہ کو کیا جواب دوں گا؟''۔
اللہ اللہ! کیا لوگ تھے۔

یہ چند مثالیں ملکی معاملات میں ان کی اصول پسندی اور بے غرضی کی تھیں۔ سیٹھ صاحب کو عالمِ اسلام کے مسائل سے بھی گہری دل چسپی تھی۔ وہ بساط بھر کوشاں رہتے تھے کہ ان کی یکسوئی ہو، اور ان کا ایسا حل نکل آئے جو طرفین کے لیے قابلِ قبول ہو۔ اس ضمن میں ان کی دو دردمندانہ کوششوں کا مختصر سا حال سنیے:

ہم اوپر شیعہ سنی مناقشہ کا ذکر کر آئے ہیں، جو ملک کے اندر پیش آیا تھا، اور جسے رفع دفع کرنے میں سیٹھ صاحب نے بڑے تدبر اور دانش مندی سے کام لیا تھا۔ تقریباً اسی زمانے کی بات ہے کہ بین الاقوامی سطح پر سُنّی عراق اور شیعہ ایران کے درمیان بڑی طویل اور خوں ریز جنگ ہوی تھی۔ ریگن کی صدارت کا زمانہ تھا۔ امریکہ نے ان دو پڑوسیوں کو خوب شہہ دی۔ مسلم دشمنی کے ارمان جی بھر کر نکالے۔ دس لاکھ انسانوں کو خونِ ناحق میں نہلایا، لاکھوں بیوہ اور یتیم ہو گئے۔ دونوں ملکوں کی معیشت تباہ و برباد ہو گئی۔ عزت و آبرو جاتی رہی سو الگ۔ بہر حال یہ داستان بڑی طولانی ہے اور خونچکاں بھی۔

یہاں کہنا یہ ہے کہ ہمارے سیٹھ صاحب سے ملت کے جان و مال اور عزت و وقار کا یہ زیاں دیکھا نہ جاسکا۔ ان کا دلِ دردمند بے چین ہو گیا۔ انھوں نے آیت اللہ خمینی اور صدام حسین سے جا کر ملاقات کی اور طرفین کے درمیان مفاہمت اور مصالحت کی پوری کوشش کی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان رہ نماؤں کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ انسان جدوجہد کا مکلف ہے، نتائج کا نہیں۔ سیٹھ صاحب نے بھی یہی کیا۔ مدت بعد جنگ بلاشبہ رک گئی، روک دینی پڑی۔ پر وہی بات:

آنچہ دانا کند کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

عالم اسلام کے سیاسی مسائل میں انھیں مسئلۂ فلسطین سے بھی پوری دل چسپی تھی۔ صیہونی مظالم پر ان کا دلِ دردمند بہت کڑھتا تھا۔ وہ پی ایل او کے صدر نشین ابو عمار یاسر عرفات مرحوم کے دوست تھے

اوران سے انتہائی مخلصانہ تعلقات رکھتے تھے۔ فلسطینی کاز کی حمایت کے لیے وہ برابر کوشاں رہتے تھے۔

چناں چہ ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد جس میں اسرائیل فتح منداور عرب پسپا ہو گئے، سیٹھ صاحب نے اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر ایک تنظیم Indo Palestinian Friendship Forum قائم کی، اوراپنی طویل ملی خدمات کے بل بوتے پر اس تنظیم کے جنرل سکریٹری منتخب کر لیے گئے۔ حق بحق دار رسید

اس تنظیم کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسرائیل کی وحشت و بربریت اور دہشت گردی کو تشت از بام کیا جائے اور جلا وطن اور مظلوم فلسطینیوں کے کاز کی حمایت کے لیے اس عظیم ملک کی رائے عامہ ہموار کی جائے۔ سیٹھ صاحب نے اپنی مصروف سیاسی زندگی میں اس تنظیم کے لیے بھی وقت نکالا۔

اللہ تعالیٰ جامعہ دارالسلام عمرآباد کے سکریٹری کاکا محمد عمر ثانی کو غریق رحمت کرے، بہت یاد آتے ہیں۔ مرحوم کے ملک کے ہر طبقے کے مسلم اساطین اور رہ نماؤں سے گہرے مراسم تھے۔ اس ضمن میں جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب سے بھی تعلقات تھے، دوستانہ تھا۔ چناں چہ اپریل ۱۹۷۷ء میں جامعہ کا سہ روزہ شان دار جشن طلائی منایا گیا، اوراس میں عرب وعجم کے متعدد اکابر واعاظم نے شرکت کی تو ان میں ہمارے سیٹھ صاحب بھی موجود تھے۔ مجھے اسٹیج پر انھیں پہلی بار بہت قریب سے دیکھنے اوراردو میں ان کی رواں، زوردار اور ایمان افروز تقریر سننے کا موقع ملا تھا۔ اس ولولہ انگیز خطاب کے دوران اقبال کے اشعار گرج گرج کر اُن کا پڑھنا یاد ہے، اور چالیس برس بعد اس کی گونج کانوں میں تھوڑی بہت اب بھی باقی ہے۔ مولانا شبلی مرحوم کا ایک شعر یاد آرہا ہے:

سالہا گوش جہاں زمزمہ زا خواہد بود
زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ ام

(اس دنیا میں میری کی ہوی نغمہ سرائی سے ایک زمانے تک کانوں میں رس گھلتا رہے گا)

اس کے دو تین برس بعد فروری ۱۹۸۰ء میں ان کا دیدار بنارس میں نصیب ہوا، جہاں وہ جامعہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم کے زیر اہتمام سہ روزہ موتمر الدعوۃ والتعلیم میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ دیدار جلسہ گاہ میں نہیں، ان کی قیام گاہ (ہوٹل) پر ہوا جہاں وہ ہمارے کاکا محمد عمر صاحب اوران

کے بھائی، جامعہ کے موجودہ سکریٹری مولانا کا کا سعید احمد صاحب عمری حفظہ اللہ کے ساتھ فروکش تھے۔ یاد ہے کہ ان کے درمیان برادرانہ یگانگت تھی۔ کا کا صاحب انھیں سیٹھ صاحب اور سیٹھ صاحب انھیں کا کا صاحب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

بہرحال! اخبارات سے یہ معلوم کرکے بے حد رنج وافسوس ہوا کہ ملک وملت کا یہ بے لوث خادم ۲۷/اپریل ۲۰۰۵ء (۷/ربیع الاول ۱۴۲۶ھ) بدھ کے دن اس دنیائے فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا۔ اناللہ.... ان کی عمر ۸۳/سال کی تھی۔ ان کی تدفین باغوں کے شہر (City of Gardens) بنگلور میں عمل میں آئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے، انھیں باغِ رضوان میں جگہ دے اور ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے ؏ ایں دعا از من، واز جملہ جہاں آمین باد

پینتیس برس پہلے کے سرسری دیدار کے بعد سراپا بس اسی قدر ذہن میں رہ گیا ہے:
نکلتا ہوا قد، بھرا بھرا بدن، گورا گورا رنگ، بڑا سر اور اس پر اونچی دیوار کی جناح کیپ، آنکھوں پر موٹی عینک، چہرہ پر گھنی ڈاڑھی، بڑا اور مسکراتا دہانہ، پاجامے اور شیروانی میں ملبوس رہتے تھے۔ سن اتر آنے پر بھی خاصے جامہ زیب تھے۔ بزرگانہ وقار کی تصویر:

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہ بانی کرے

سیٹھ صاحب کی پانچ اولادیں ہیں۔ دو بیٹے: سلیمان خالد اور محمد سراج ابراہیم۔ تین بیٹیاں: عذرا اسماعیل، رضیہ سلیمان اور تسنیم۔ کتنا اچھا ہو اگر ان سب کی مجموعی کوشش سے ان کے نامور باپ کی حیات وخدمات پر ایک جامع کتاب مرتب ہوکر منظر عام پر آجائے۔ نئی نسل ان کی کتابِ زندگی سے بہت کچھ سیکھ سکے گی۔ جینے کا حوصلہ حاصل کرسکے گی کہ سلف کے کارناموں سے واقفیت کا مقصد یہی ہے۔ اللھم وفقنا لما تحب وترضی.....

ooo